ادا جعفری کی خود نوشت "جو رہی سو بے خبری رہی" پر ایک نظر

(An overview of Ada Jafri's Autobiography
"Jo Rahi So Bekhabri Rahi")

DOI:https://doi.org/10.54692/nooretahqeeq.2024.08012136

ماہ نور مرتضیٰ
Mahnoor Murtaza
BS Urdu Research Scholar
Kinnaird College for Women, Lahore

ڈاکٹر الزبتھ شاد
Dr Elizabeth Shad
Associate Professor, Department of Urdu,
Kinnaird College for Women, Lahore

Abstract:
Ada Jafri is one of the greatest writers who presented the essence of her art in the form of poetry as well as in prose. She holds a special position amongst the pioneers of modern Urdu and is also called the first lady of poetry. Apart from poetry, she also experimented with an important genre of literature, Aap Beti (autobiography). In her autobiography, "Jo Rahi So Bekhabri Rahi" Ada Jafri has appeared in a different style. Through this autobiography, she has described the educational and social problems faced by women before the establishment of Pakistan, as well as the culture and civilization of that time. The purpose of this research article is to provide readers with historical, cultural and tourist information in the light of Ada Jafri's autobiography and to highlight the importance of autobiography in literature.

Keywords:
Autobiography, Ada Jafri, Urdu Poetry, Urdu Literature, Culture, Women's Educational Problems, Women's Social Problems, Women Writer.

برصغیر کی شاعرات میں ادا جعفری کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ان کا شمار بیسویں صدی کی نصف دہائی کی اہم شاعرات میں کیا جاتا ہے۔ شاعری و نثر نگاری دونوں حیثیتوں میں انھوں نے شہرت حاصل کی۔ شاعری کا شوق بچپن

سے ہی ان کی فطرت میں شامل تھا جس کی بنا پر ان کے کئی شعری مجموعے نہ صرف منظر عام پر آئے بلکہ قارئین سے داد و تعریف کے بھی حق دار بنے۔ ۱۹۹۵ء میں ”جو رہی سو بے خبری رہی“ کے عنوان سے ادا جعفری کی خود نوشت شائع ہوئی۔ یہ کتاب ۲۹ ابواب میں منقسم ۳۷۲ صفحات پر مشتمل مصنفہ کے شعری ذوق و مزاج کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔ ادا جعفری نے اس خود نوشت کا آغاز اپنے بچپن کی یادوں سے کیا ہے اور اُسے جس خوب صورت انداز میں پیش کیا ہے اس سے ان کے خاندانی حالات و واقعات، روایات اور اس معاشرے کی تہذیب تمدن کی جھلکیاں صاف دکھائی دیتی ہیں جو تقسیم ہند سے پہلے بدایوں میں مسلمانوں کے متوسط طبقے کے سماج کا رواج تھا۔

بدایوں شہر میں واقع ٹونک والا خاندان میں موجود بڑی حویلی میں ادا جعفری نے جس ماحول اور تہذیب میں آنکھ کھولی وہ زوال آمادہ جاگیر دارانہ نظام کے گہرے اثرات میں ملوث تھا۔ یہ ایک ایسی فضا تھی جہاں مرد ذات کو عورت پر ہر معاملے میں اہمیت دی جاتی۔ ایسی روایات قائم تھیں کہ عورت کھل کر اپنے حقیقی احساسات و جذبات کا اظہار تک نہ کر سکتی تھی اور یہ روایات مردوں کی وضع کردہ تھیں۔ عورت مرد کی جاگیر اور غلام تھی اور اس کے ہر فیصلے پر لبیک کہنا عورت کا فرض تھا۔ ادا جعفری نے نہایت خوب صورتی اور دیدہ دلیری کے ساتھ اس وقت کے زمیندارانہ و جاگیر دارانہ ماحول کا نقشہ کھینچا ہے۔ وہ اپنی آپ بیتی کے آغاز میں ہی لکھتی ہیں:

> ”مرد تھے جن کی جنبش ابرو پر زندگی بھر کی خوشیوں یا محرومیوں کے فیصلے ہوتے تھے اور بیبیاں تھیں جو ان فیصلوں کو دین ایمان کے احکام کا درجہ دیتی تھیں“(۱)

ادا جعفری نے اس قدامت پرست ماحول میں رہتے ہوئے خود کو ثابت کیا۔ اس سلسلے میں ادا کی والدہ نے رہبر و رہنما کا کردار ادا کرتے ہوئے ادا کی شخصیت کو نکھارنے میں مدد کی۔ ٹونک والے خاندان میں یہ رواج تھا کہ بیٹیاں بیاہ کر اپنے سسرال نہیں جایا کرتی تھیں۔ وہ داماد آکر گھر دامادی اختیار کرتے اور نہ ہی بیٹیوں کی شادیاں خاندان سے باہر کی جاتی تھیں۔ ادا جعفری کی والدہ نے اس روایت کے خلاف جاتے ہوئے ان کی بڑی بہن کی شادی خاندان سے باہر کر دی اور ادا جعفری کی بہن کو ان کے شوہر کے ساتھ روانہ کر دیا۔ اس دور میں عورت کے لیے تعلیم کو ضروری نہ سمجھا جاتا تھا ادا جعفری کی والدہ سلمہ بدرالحسن نے بیوگی کے باوجود اپنے بچوں کی اچھی تعلیم و تربیت کی۔ اس طرح اس خاندان میں کئی نئی روایات نے جنم لیا اور پھر خاندان کی دوسری لڑکیوں کے لیے بھی تعلیم کے دروازے کھلتے گئے۔

یہ ایک ایسی لڑکی کی کہانی ہے جو بے چین، اکیلی اور ہجوم میں بھی تنہا ہے جسے پانچ سال مسلسل اپنے والد کا انتظار کرنے کے بعد ان کی موت کی حقیقت سے آگاہ کیا گیا۔ ادا جعفری نے اپنی باطنی بے چینی اور تنہائی کو دور کرنے کے لیے اپنا رشتہ کتابوں سے جوڑا اور اپنی تنہائی کو تخلیقی لمحوں میں بدلنا شروع کیا۔ انھوں نے نو سال کی عمر میں سب سے چھپ کر پہلا شعر کہا جسے ان کی والدہ نے بہت پسند کیا۔ اس تنہائی میں انھوں نے بادلوں، ہواؤں اور ستاروں سے گہرا تعلق قائم

کیااور ان خوب صورت قدرتی مناظر کی تصاویر کو شاعری میں تبدیل کیا۔ ادا جعفری کے اشعار سویرا، افکار، شاہکار اور ادبِ لطیف میں شائع ہونا شروع ہوئے۔ انھوں نے بڑی حویلی سے دوستی کی روایت قائم کی۔ وہاں ان کی رسائی ایک کتب خانے تک ہوئی جہاں وہ سب سے چھپتے چھپاتے کتابوں کا مطالعہ کرتیں اور شعر کہتیں۔ ان کتابوں نے ان کے لیے مسیحائی کا کام کیا وہ لکھتی ہیں:

"میں نے کتاب کو انسان کے مقابلے میں حیات کے قریب تر دیکھا تھا جب میں اندھیروں کے جنگل میں کھو گئی تھی اور میں جگنوؤں سے اُجالا چاہا تھا تو یہ میرے رہنما ستارے بن گئیں تھیں۔"(۲)

ادا جعفری کی اس داستانِ حیات کا مطالعہ کئی زاویوں سے کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے نہ صرف اپنے تجربات و مشاہدات بلکہ اس دور کی روایات، رسم ورواج، تہذیب و تمدن کے ساتھ ساتھ حالات و واقعات کو بھی بیان کیا۔ جس سے اس دور کے بارے میں کافی معلومات ملتی ہے۔ اپنی خود نوشت کے ایک باب "بدایوں کے شام و سحر" میں لکھتی ہیں بدایوں کو پیراں شہر اور گنج شہیداں بھی کہا جاتا یہ ماموں بھانجے کا مزار تھا اور بدایوں میں یہ رواج تھا کہ اگر کسی کے گھر بچہ پیدا ہو تا تو ماں اور بچہ نہا کر سب سے پہلے اس مزار پر حاضری دیتے وہاں بچے کی ماں دو نوافل شکرانے کے ادا کرتی اور کچھ رقم چراغی کی حیثیت سے بھی دیتی۔ رمضان کے مہینے کا بھی نہایت خوش دلی سے استقبال کیا جاتا۔ نمازیں طویل ہو جاتیں، بچے بڑے سبھی روزے رکھتے اور مساجد میں افطاریوں کا اہتمام کیا جاتا عید والے دن کو بھی خوشی سے منایا جاتا لیکن عید والے دن خاندان کے کسی بزرگ کا انتقال ہوا تھا اس لیے عید کے دن ان کا غم بھی منایا جاتا۔ قرآن خوانی کے علاوہ فقرا میں کھانا بھی تقسیم کیا جاتا۔ اسی طرح ماہ محرم کا بھی احترام کیا جاتا۔ عاشورہ تک نئے اور شوخ رنگ کے لباس نہ استعمال کیے جاتے۔ صاحب حیثیت لوگوں کے گھر نیاز بھیجی جاتی اور بزرگ بچوں کو کربلا کا واقعہ تفصیل سے سناتے اور اس کی اہمیت بتاتے۔ بدایوں میں لڑکی اور لڑکے کا رشتہ طے کرنے کی رسم نہایت لطیف ہوتی شادی بیاہ خوشی و غمی کسی دعوت کے لیے بلاوے کی اطلاع دینا یہ سب کام خواتین کے لیے نائن کرتی تھی۔ نائن لوگوں کے گھر رشتہ لے کر جاتی اور رائے معلوم کرتی رشتہ کروانے کا سلسلہ مہینوں تک چلتا، اگر لڑکی والوں کی جانب سے رضامندی ہوتی تو وہ نائن کے پان میں الائچی شامل کر دیتے جو رشتہ کے "ہاں" کی علامت ہوتی اور نائن لڑکے والوں کی طرف جا کر بڑی خوشی سے مبارک باد دیتے ہوئے کہتی کہ آج مجھے الائچی والا پان کھلایا گیا۔ بدایوں میں شادی کے موقع پر سات قسم کا کھانا ہوتا جسے "تورہ بندی" کہا جاتا اور نائن کی یہ ذمہ داری ہوتی کہ وہ لوگوں کے گھروں میں کھانا پہنچائے۔

ادا جعفری نے اس خود نوشت میں جہاں فکری پہلوؤں کا ذکر کیا ہے وہیں فنی عناصر کو بھی ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ آپ بیتی کے ابتدائی ابواب میں ہی انھوں نے بہت سی شخصیات کے خاکے بیان کیے ہیں جن میں ایک اہم نام ان کے نانا

مولوی ظہور حسن کا ہے جو بے حد غنی اور روشن خیال طبیعت کے مالک تھے۔ ادا کے والد کی وفات کے بعد انھوں نے بچوں سے بہت محبت کی ان کی ضروریات کا خیال رکھا اور ادا کی فرمائش پر انھیں لغاتِ کشوری بھی بطور انعام دی۔ اپنی نانی کا ذکر کرتے ہوئے ادا جعفری لکھتی ہیں:

> "بدایوں کی چند محبوب یادوں میں سے ایک میری نانی کی یاد ہے۔ جس آواز سے ہر صبح ہماری آنکھ کھلتی وہ ان کی تلاوت کلام کی خوش لحن، مدھم شیریں آواز تھی۔"(۳)

ادا جعفری کی نانی نہایت سادہ اور نیک خاتون تھیں جو ہر وقت ہر شخص کی مدد کے لیے تیار رہتیں۔ فصل کی کٹائی کے وقت جھولیاں بھر کی حاجت مندوں میں اناج تقسیم کرتیں اور فارغ وقت میں قصص الانبیا پڑھتیں۔ انھوں نے اپنی خودنوشت میں اپنی حقیقی خالہ صفیہ اور اپنی قدیم ملازمہ رحمتی کا ذکر کیا ہے۔ بادل خاں کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتی ہیں کہ بدایوں کی یاد کے ساتھ ساتھ بادل خاں کا حوالہ بھی جڑا ہے جو بدایوں میں غلّہ کی کوٹھڑی کی حفاظت کرتے تھے اور اس کے انچارج تھے۔ وہ اپنا کام نہایت ایمان داری اور دیانت داری سے کرتے اور اپنی ذمہ داری احسن طریقے سے نبھاتے تھے۔

ادا جعفری کی اس خودنوشت میں ماضی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہ دشواریاں، محرومیاں اور مجبوریاں جو ماضی کا مقدر تھیں انھیں یاد کرتے ہوئے بھی ماضی کی ہر تصویر حسین اور عزیز دکھائی دیتی اور شب و روز جن سے ماضی میں کئی شکایتیں اور گلے شکوے تھے آج اتنے دور سے دیکھتے ہوئے ادا جعفری کو دلکش دکھائی دیتے ہیں۔ بدایوں کو دل والوں کا شہر کہا جاتا ہے بہت سے علما، صوفیا اور شہدا اس کی مٹی میں دفن ہیں۔ اس دور میں عورت کو وہ مقام حاصل نہ تھا جو مردوں کو حاصل تھا۔ ادا جعفری دل میں کئی حسرتیں لے کر اس شہر سے نکلیں اس میں سے ایک اہم خواہش اور حسرت اس شہر کی سیر تھی وہ لکھتی ہیں:

> "میں نے بدایوں کی شمسی مسجد آج تک نہیں دیکھی اور نہ ان بزرگوں کے مزارات کی زیارت ان کے کمالات کی روشنی میں کی۔"(۴)

بدایوں میں ادا جعفری کے نانا کے پاس نظامی پریس سے اخبار "ذوالقرنین" اور انگریزی روزنامچہ "سنانیر" کے علاوہ دو ادبی رسائل بھی آتے تھے جن میں ادا جعفری کی نظمیں شائع ہوتی تھیں اور یہی دورِ جدید شاعری اور مختصر افسانے کے عروج کا عہد تھا۔ ادا جعفری کی شاعرانہ صلاحیتوں کو اُبھارنے، اُن کے شعری ذوق کو داد و تحسین دینے میں ان کے بہنوئی جمال احمد کا ہاتھ ہے۔ ادا نے ۱۹۴۷ء میں اپنی شادی سے قبل اپنا پہلا شعری مجموعہ "میں ساز ڈھونڈتی رہی" ترتیب دے کر ناشر کے حوالے کر دیا جو ۱۹۵۰ء میں تین سال بعد شائع ہوا جس کا دیباچہ ادا کی درخواست پر قاضی عبد الغفار نے اور سرِ ورق ممتاز منصور عبد الرحمن چغتائی نے تحریر کیا۔ یہی وہ دور تھا جس میں شاعری میں نظمِ معریٰ اور آزاد نظم

متعارف ہوئیں اور جدید مختصر افسانہ اپنے کمال کی منزل کو پہنچا، عصمت چغتائی، بیدی، احمد ندیم قاسمی، مرزا ادیب، ممتاز مفتی اور کرشن چندر نے بہترین افسانے تحریر کیے۔ اثر لکھنوی سے ادا جعفری کی پہلی ملاقات ۱۹۴۹ء میں سول سروس اکیڈمی پاک و ہند مشاعرے میں ہوئی۔

۱۹۳۶ء لندن میں ترقی پسند تحریک وجود میں آئی جس نے ادا جعفری کو سماجی زندگی کے میلے میں شرکت کا احساس عطا کیا۔ نظم و نثر دونوں میں نئی اور تازہ تبدیلیاں پیدا ہوئیں اور اسی دور میں ایک نیا موضوع ادب برائے ادب یا ادب برائے زندگی سامنے آیا۔ ترقی پسند تحریک نے اردو ادب کو فیض، مرزا ادیب، عصمت چغتائی اور اختر الایمان وغیرہ جیسے شاعر اور کئی نامور ادیب عطا کیے۔ یہی وہ دور تھا جس میں تین رجحان ساز شاعر "ن۔م راشد، میرا جی اور فیض" اپنی الگ پہچان، شناخت اور اسلوب کے ساتھ نمایاں ہوئے۔

ادا جعفری اپنی اس خود نوشت میں فیض کے ساتھ ترکی کے ایک شاعر "ناظم حکمت" کا ذکر کرتی ہیں اور کہتی ہیں کہ دونوں کی شاعری اور زندگی میں کہیں نہ کہیں مماثلت ضرور ہے دونوں غم جاناں سے غم دوراں کی طرف آئے تھے۔ ناظم حکمت ترکی کا جدید شاعر تھا جس کے کلام کا ترجمہ پچاس سے زیادہ زبانوں میں ہوا۔ آزادی اور مساوات کا خواب دیکھنے والے اس عظیم شاعر کا شمار بیسویں صدی کے اہم ترین میں ہوتا ہے جس نے کئی سال قید میں اذیت کے ساتھ گذارے اور ان کی کتابیں اور نظمیں ان کی موت کے بعد ترکی میں شائع ہوئیں۔ اس خود نوشت میں ادا جعفری کی مختلف تصویریں دکھائی دیتی ہیں پہلی تصویر میں بدایوں کی الجھی الجھی بالوں والی اس کم سن تنہا اور اداس لڑکی نظر آتی ہے جس کی پوری دنیا اس پھاٹک کے اندر آباد تھی جسے "ٹونک والا پھاٹک" کہتے تھے۔ دوسری تصویر اس ادا کی ہے جس نے صرف مٹھی بھر آسمان دیکھا تھا، اس نے پوری دنیا کی سیر کی، دونوں تصویریں ایک دوسرے سے مختلف ہونے کے باوجود بہت ملتی جلتی ہیں اور ان میں ایک دوسرے کا عکس صاف نظر آتا ہے۔

ادا جعفری نے اس آپ بیتی میں تقسیم ہند اور اس کے نتیجے میں ہونے والے فسادات کا ذکر کیا۔ اس دردناک ماحول کی تصویر انھوں نے اس انداز میں کھینچی ہے کہ پورا ماحول آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے، شہروں اور گاؤں میں مذہب کے نام پر فسادات جاری تھے۔ بدایوں میں اگرچہ قتل و غارت اور خون ریزی کے مظاہرے نہیں ہو رہے تھے لیکن اس کے باوجود لوگوں کے دل خوف سے لرز رہے تھے۔

اس آپ بیتی کے ایک باب میں "میں آپے رانجھا ہوئی" میں ادا جعفری قیام پاکستان کے سلسلے میں اغوا ہونے والی لڑکیوں کی بازیابی کا ذکر کرتی ہیں کہ بہت سے بیٹیوں کو اپنے والدین سے دور جانا پڑا اور ان کی بازیابی کے وقت والدین نے بھی اپنی مظلوم و مجبور بیٹیوں کو پہچاننے سے انکار کر دیا یہ عورتیں کبھی اپنی اور کبھی غیروں کی دہلیز پر قربان ہوتی رہیں۔

جنوری ۱۹۴۷ء کو ادا بدایونی کی شادی نورالحسن جعفری سے ہوئی اور وہ ادا بدایوانی سے ادا جعفری بن گئیں۔ نورالحسن سرکاری ملازمت کرتے رہے اور قیامِ پاکستان کے بعد انھوں نے پاکستان میں ملازمت کرنے کا فیصلہ کیا اور اس غرض سے کراچی چلے گئے۔ سرکاری نوکری کی وجہ سے نورالحسن کا تبادلہ مختلف ممالک میں ہوتا رہا اور ان کے ساتھ ادا جعفری کو بھی دنیا گھومنے کا موقع مل گیا۔ جہاں ان کی ملاقات دنیا کے عظیم اور بڑے مدیروں، دانشوروں، شاعروں، ادیبوں اور بڑے سیاسی رہنماؤں سے ہوئی جن کا تفصیل سے ذکر ان کی آپ بیتی میں کیا گیا ہے۔ وہ جس بھی ملک کی سیر کرتے وہاں کی سماجی اور ثقافتی زندگی کے ایک ایک پہلو کو ادا جعفری نے اپنے لفظوں میں محفوظ کیا۔ اس خود نوشت کی ایک خاص بات یہ ہے کہ ادا جعفری کی داستان حیات ان کی زندگی کے کئی چھوٹے چھوٹے سفر ناموں کا احاطہ کرتی ہے۔ ۱۹۴۸ء میں ملٹری اکاونٹس سروس کے لیے نورالحسن کا انتخاب ہو گیا اور نورالحسن کو راولپنڈی جانا پڑا اور ادا ان کے ساتھ نہ جا سکیں کیوں کہ وہ زندگی کے ایک حسین تجربے سے گزر رہی تھیں لیکن قدرت کی کرنی یہ ہوئی کہ جس کا وہ بے تابی سے انتظار کر رہی تھیں وہ کچھ دن مہمان دنیا میں آکر واپس چلا گیا۔ اس سانحے کے بعد نورالحسن جعفری ادا کو اپنے ساتھ راولپنڈی لے گئے۔ ادا جعفری نے اس خود نوشت میں اپنے تجربے کا ذکر کیا ہے کہ انسان کو بعض اوقات جس چیز کی تمنا ہو اگر قسمت میں نہ ہو تو وہ قریب آکر بھی بہت دور چلی جاتی ہے۔ اس واقعے کے بعد زندگی سے ہاری ادا جعفری کو نورالحسن جعفری نے جینا سکھایا۔ نورالحسن جعفری جب وہ دو سال کے تھے تو اُن کی والدہ وفات پا گئی تھیں۔ ادا جعفری اپنی خود نوشت کے ایک باب "ورنہ سفر حیات کا بے حد طویل تھا" میں نورالحسن جعفری کی شخصیت کے بارے میں لکھتی ہیں:

> "نور کے وجود میں بیک وقت دو بڑی دل آویز شخصیتیں سانس لیتی ہیں۔ ایک حفاظت اور امان کی علامت وہ چھتنار، گھنا سایہ جسے باپ کہتے ہیں اور ایک وہ بچہ جو دو سال کی عمر میں اپنی ماں سے بچھڑ گیا تھا۔ میلے میں کھویا ہوا ایک اکیلا بچہ زندگی اپنی تمام مزاجیوں اور سب جھمیلوں کے باوجود خوب صورت بھی ہے اور مہربان بھی۔ نور نے سائبان بن کر مجھے موسموں کی شدت سے محفوظ و مامون رکھا ہے۔"(۵)

راولپنڈی میں ادا جعفری کی ملاقات اہم شعرا سے ہوئی جن میں ن۔م راشد، منٹو اور عبد الحمید عدم شامل ہیں۔ ادا جعفری کی یہ خود نوشت ان کی شادی کے بعد ایک الگ قسم کا رخ اختیار کر گئی جس میں انھوں نے مختلف ممالک کے سفر اور وہاں کے تجربات اور مناظر کو بیان کیا ہے۔ قسمت نے ادا جعفری کے غم کا مداوا کرنے کے لیے ایک رحمت ان کی جھولی میں ڈال دی جس کا نام انھوں نے صبیحہ رکھا۔ ۱۹۵۶ء میں نائب مالی مشیر کی حیثیت سے نورالحسن جعفری کا تقرر کراچی میں وزارت دفاع کے طور پر ہوا۔ ادا جعفری نے مختلف ممالک کی سیر کے ساتھ ساتھ وہاں کے مناظر کو نہایت

خوب صورتی سے بیان کیا ہے۔ وہ اپنے کراچی والے گھر کی منظر نگاری اس انداز میں کرتی ہیں:

"ہمارا گھر جس علاقے میں تھا نیپئر بیرکس کہا جاتا تھا وہاں جتنے مکان تھے وہ سب ایک ہی نقشے کے مطابق بنے ہوئے تھے۔ سرخ ٹائل کی ڈھلوان چھتیں باہر کے برآمدے میں لکڑی کی جالی اور سامنے چھوٹا سا گوشہ چمن۔"(۶)

کراچی میں ادا جعفری کے دوستوں کا حلقہ بہت وسیع رہا جن میں نورالحسن کے دفتر، کالج اور یونیورسٹی کے ساتھیوں کے علاوہ محمد سلمان، جمیل الدین عالی، حسن عسکری اور کئی عزیز دوست بھی شامل ہیں، ایک اچھے لکھاری کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ اس کے قول و فعل میں تضاد نہیں ہوتا جو وہ سوچتا ہے اسی کو قلم بند کرتا ہے۔ ادا جعفری کے ہاں یہ خصوصیت نمایاں ہے۔ ان کی شخصیت اور تحریروں میں کوئی تضاد نہیں۔ وہ شائستہ، تہذیب یافتہ، سادہ دل اور حساس نظر آتی ہیں۔ ان کے ظاہر اور باطن میں فرق نہیں۔ انھوں نے اپنی ہم عصر شاعرات کے علاوہ اپنے سے قبل شاعرات کا تذکرہ بھی عزت و احترام سے کیا ہے۔ کسی ادبی منظر نامے میں شامل ہونے والی مشہور و معروف اہلِ قلم کا ذکر ہو یا کسی غیر معروف خاتون کا ذکر کرنا ہو انھوں نے کبھی کوئی امتیازی سلوک نہیں برتا۔ ۱۹۷۳ء میں ممتاز شیریں کی وفات پر اپنی نظم بلاوامیں انھیں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

وہ جو چپ چاپ بھری بزم سے اُٹھ کر چل دیں
یوں دبے پاؤں کہ جیسے کہیں آئیں نہ گئیں
بے نیازی تھی کہ خودداری فن تھی لوگو
شب کی مہماں کوئی گم گشتہ کرن تھی لوگو (۷)

یہ عورت کی فطرت ہے کہ وہ اپنے سے اعلیٰ مقام پر فائز عورت کو دیکھ کر حسد کرتی ہے۔ ادا جعفری ان خرافات سے پاک تھیں۔ انھیں اپنی شخصیت اور ذات پر اس قدر اعتماد تھا کہ انھوں نے اپنی روشنی کو نمایاں کرنے کے لیے کبھی کسی کا چراغ بجھانے کی کوشش نہ کی۔ "ایک سب آگ ایک سب پانی" کے نام سے ایک خوب صورت باب "جو رہی سو بے خبری رہی" میں شامل ہے۔ اس باب کے مطالعے سے ادا جعفری کی "علم پسندی" کا اندازہ ہوتا ہے اپنی ذات کی قید سے نکل کر زندگی کے مختلف تجربات اور مظاہرات کو کھلی آنکھ سے دیکھنے کی تمنا ادا جعفری کی فطرت میں ابتدا سے شامل تھی اپنی تخلیقی لگن، مشاہدے اور علمی جستجو کی بنا پر اپنے اس انبساط کو حاصل کرنے میں کامیاب رہیں، انھوں نے مختلف معاشرے، تہذیبوں اور سرزمینوں کا ایک محدود زندگی سے نکل کر نظارہ کیا تو ان کے وجود میں بچپن سے سوئی ہوئی تمنائیں اور آرزوئیں ایک ایک کر کے بیدار ہوئیں۔

یہ خود نوشت نہ صرف ادا جعفری کی زندگی کی داستان ہے بلکہ یہ ایک عمدہ معلومات کا ذخیرہ بھی ہے۔ "آمش"

کے عنوان سے اس کتاب میں ایک باب موجود ہے جس میں پرانے روایتی امریکی قبیلے کے بارے میں معلومات فراہم کی گئی ہے۔ ان معلومات کا آغاز انھوں نے قارئین کی توجہ بڑھانے کے لیے ایک قصے سے کیا ہے جو ادا کی بیٹی صبیحہ اقبال نے انھیں سنایا تھا۔ انھوں نے اس باب میں آمش قبیلے کے رہن سہن، تہذیب و تمدن، مذہبی عقائد، ان کے طرز زندگی عادات و اطوار، رسم و رواج، لباس اور وضع قطع کو نہایت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ جس کے ذریعے امریکہ کی معاشرتی زندگی کو متنوع، گہرائی اور تمام تر تضادات کے ساتھ سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ واشنگٹن کے سفر کے دوران میں ادا جعفری نے ایک ایسے گھر کی سیر کی جس کا تعلق پرانے آمش سے تھا اور اس گھر اور ان کے رسم رواج کے بارے میں دل چسپ معلومات فراہم کیں کہ گھر کا سب سے دل چسپ اور بڑا کمرہ "باورچی خانہ" ہوتا جہاں کھانا پکانے کے علاوہ نوجوان نسل کی قسمت کے فیصلے بھی ہوتے۔ یہ وہ فرقہ تھا جو نہایت شدت پسند تھا اور سائنس کی ایجادات کو اللہ کے قانون سے انحراف سمجھتا تھا۔

ادا جعفری نے بڑی عمدگی سے امریکہ کی جدید سائنسی ترقی اور علم و فن کا موازنہ آمش قبیلے کے رہن سہن اور مذہبی عقائد اور تہذیب و معاشرت سے کیا ہے۔ یہ تقابلی مطالعہ قاری کے لیے نہ صرف تفریح کا سبب بنتا ہے بلکہ معلومات کا بھی ایک بہترین ذخیرہ ہے۔ اس خود نوشت کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس میں ادا جعفری نے وقتاً فوقتاً اپنے تمام قریبی، مخلص اور عزیز دوستوں کا ذکر کسی نہ کسی حوالے سے ضرور کیا ہے۔ سترھویں باب "سلسلے" میں ادا جعفری نے کئی ممتاز ادیبوں اور قلم کاروں سے اپنے تعلقات اور دوستانہ مراسم کے حوالے سے اپنی یاداشتیں بیان کیں جن کو پڑھ کر قاری کو ان عظیم شخصیات کی نجی زندگی، عادات و اطوار اور ان کی زندگی کے خاص پہلوؤں کے بارے میں معلومات ملتی ہیں۔ ان میں ایک اہم نام قدرت اللہ شہاب کا ہے جن سے ادا جعفری کا رسمی تعارف ۱۹۵۸ء میں کراچی میں ہوا شہاب صاحب کے بیٹے ثاقب اور ادا جعفری کے بیٹے عامر کے آپس میں دوستانہ تعلقات کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ کہ دونوں لڑتے جھگڑتے اور کھیلتے کودتے ہوئے بڑے ہوئے اور دونوں ڈاکٹر ہیں۔

۱۹۶۷ء میں ادا جعفری کا دوسرا شعری مجموعہ "شہر درد" شائع ہوا راولپنڈی اور اسلام آباد قیام کے دوران میں ادا جعفری نے سلسلہ کے نام سے ایک ادبی نشست کا اہتمام کیا اس کا منشور اور قوائد و ضوابط طے ہونے کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ ہر ماہ کسی ایک رکن کے گھر اس ادبی محفل کا اہتمام ہو گا اس ادبی محفل کے اہم ارکان میں ضیا جالندھری، قدرت اللہ شہاب، کرنل محمد خان، نثار عزیز بٹ اور سید ضمیر جعفری وغیرہ شامل تھے۔ نورالحسن کا تبادلہ کراچی ہونے کی وجہ سے انھیں یہ سب چھوڑ کر کراچی جانا پڑا۔

۱۹۶۱ء میں نورالحسن جعفری ممبر فنانس واپڈا کے عہدے پر فائز ہوئے۔ جس کی بنا پر انھیں دوبارہ لاہور جانا پڑا۔ لاہور میں حاجرہ مسرور، خدیجہ مستور کے علاوہ صادقین سے بھی ادا جعفری کی ملاقات ہوئی۔ اٹھارویں باب "کچھ

اجالے اور" سے یہ خود نوشت ایک سفر نامے کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ ادا جعفری نے صبیحہ اور عزمی کے ہمراہ ایبٹ آباد سے مانسہرہ، بالا کوٹ، ناران، کالام اور جھیل سیف الملوک کا سفر کیا۔ اس باب میں ادا جعفری کی منظر نگاری اپنے عروج پر ہے۔ قدرتی مناظر کی تصویر کشی انھوں نے نہایت عمدہ انداز میں کی ہے۔ یہ خوبی ان کی پوری خود نوشت پر غالب نظر آتی ہے۔ وہ جھیل سیف الملوک کی منظر نگاری اس انداز میں کرتی ہیں:

"اور پھر ہم رنگ و نور کی ایک ایسی دنیا میں پہنچ گئے جہاں پلک جھپکنا آنکھ کی تقصیر معلوم ہو۔ فاصلے سے دیکھا تو جیسے سفید بدلیوں کے ساتھ آسمان کا کوئی ٹکڑا زمین پر بچھا ہو اور پاس پہنچے تو دور پہاڑوں پر دمکتی ہوئی برف اب ہمارے قدموں میں جگہ جگہ بکھری ہوئی تھی اور سامنے سیف الملوک جھیل کا نیلا پانی ہمیں تک رہا تھا۔"(۸)

بیرونی ممالک میں ادا جعفری کا پہلا سفر ۱۹۴۸ء میں بنکاک کا تھا۔ نور الحسن جعفری کا انتخاب عالمی بنک کی جانب سے اکنامک ڈویلپمنٹ انسٹی ٹیوٹ (ڈی۔ ڈی۔ آئی) میں چھ ماہ کے کورس کے لیے ہوا تھا۔ بنکاک خوب صورت شہر تھا۔ اس شہر کی سب سے بڑی کشش جو ادا جعفری کو اپنی طرف مقناطیس کی طرح کھینچتی ہے، وہاں کی صاف کشادہ سڑکیں اور عالی شان شاہی محل تھے مگر ادا جعفری کو اپنے وطن سے ہزاروں میل دور ہونے کے باوجود اپنے ہی وطن کا خیال رہتا تھا۔

ستمبر ۱۹۴۸ء کو ادا جعفری واشنگٹن گئی تھیں جو کہ ایک خوب صورت شہر ہونے کے ساتھ ساتھ یورپ کا ایک تاریخی شہر بھی ہے۔ تاریخی عمارتوں میں مشہور عمارتیں لنکن موریل، جیفرسن میموریل اور کیپٹل ہل وغیرہ ہیں۔ واشنگٹن میں سمتھ یونین ایک ایسا میوزیم ہے جہاں پر پہلا ہوائی جہاز جو رائٹ برادران نے بنایا تھا نمائش کے لیے رکھا گیا تھا۔ ادا جعفری بچپن سے ہی ہجوم سے بہت گھبراتی تھیں اس لیے مشاعروں میں بہت کم شریک ہوئیں لیکن امریکہ کے پہلے مشاعرے میں نہ صرف شریک ہوئیں بلکہ اس کا حصہ بھی بنیں۔ اس سفر میں انھوں نے امریکہ کے سیاسی حالات کا بھی مشاہدہ کیا۔ علاوہ ازیں ہانگ کانگ سے ٹوکیو کا سفر کیا اور وہاں سات عجائب دیکھے۔ ٹوکیو کو روشنیوں کے علاوہ پھولوں کا شہر بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد ادا جعفری نے سان فرانسسکو اور لاس اینجلز کا سفر کیا جہاں انھوں نے ہالی وڈ اور ڈزنی لینڈ کی سیر کی۔

ادا جعفری نے اپنے ان مختلف ممالک کے سفر کے دوران میں بہت سے مشاہدات کیے اور قاری کو بھی ان سے شناسائی دلائی۔ مختلف ممالک کی تہذیب کو قریب سے دیکھا امریکہ اور انگلینڈ میں اور کئی چیزوں کے فرق کے علاوہ ان لوگوں کے مزاج میں بے انتہا فرق ہے۔ انگریز اپنے معاشرے اور تاریخ پر فخر کرتے ہیں اور سب کو اپنے سے کم تر سمجھتے ہیں۔ امریکن خوش دلی اور خوش اخلاقی سے ہر راہ چلتے شخص سے بھی خوش دلی سے پیش آتے ہیں۔ ادا جعفری نے لندن کا

یہ سفر اس وقت کیا جب ان کے بیٹے عامر کی عمر تقریباً ۶ برس تھی۔

اس خود نوشت کا یہ حصہ جس میں سفر ناموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ بے حد دلچسپ اور اہم معلومات پر مبنی ہے۔ ادا جعفری مختلف ممالک کے سفر کے دوران میں ان ممالک کی وجہ شہرت بھی بتاتی ہے کہ ہالینڈ پھولوں خصوصاً ٹیولپس نامی پھولوں کے لیے دنیا بھر میں مشہور ہے جب کہ پیرس کو فن کاروں اور خوش خیالوں کا شہر کہا جاتا ہے۔ پیرس میں ہی ایفل ٹاور ہے جو دور سے سیاحوں کو اپنے قریب بلاتا ہے۔ پیرس سے روم جاتے وقت راستے میں ایک مقام جنیوا آتا ہے جسے گل و گلزار وادیوں اور شاداب مرغزاروں کا شہر کہا جاتا ہے جب کہ مجسموں اور فواروں کا شہر روم کہلاتا ہے اور استنبول دیدہ زیب مساجد کے لیے مشہور شہر ہے۔ اس ملک میں بہت سے بزرگان دین جیسا کہ مولانا رومیؒ وغیرہ کے مزار موجود ہیں۔

ادا جعفری استنبول کے شاہی میوزیم توپ کاپی سرائے کا ذکر کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ اس میوزیم میں مرصع کاری کے بے مثال نمونوں، بے شمار نوادرات، قیمتی ہیرے وجواہرات سے جڑے ملبوسات اور ظروف کے علاوہ قرآن مجید کا وہ نسخہ بھی موجود ہے، حضرت عثمانؓ اپنی شہادت کے وقت جس کی تلاوت کر رہے تھے اور یہ پاک کلام اسی صفحے پر کھلا ہوا ہے جس پر حضرت عثمان غنیؓ کے لہو کے قطرے گرے تھے۔ استنبول میں نبی پاک ﷺ کے عزیز صحابہ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا مزار اور مسجد واقع ہے۔ اس مسجد میں دی جانے والی اذان کے سحر میں ادا جعفری اس قدر ڈوب گئیں کہ انھیں اس کا اندازہ خود بھی نہ ہوا۔ انھوں نے اس کیفیت کو اپنی ایک نظم "دید کا لمحہ" میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

استنبول سے انھوں نے اگلا سفر جاگتی راتوں اور خوش وشوقین مزاج سیاحوں کے شہر بیروت کا کیا جہاں انھوں نے ایک مشہور غار اور قدیم شہر بعلبک بھی دیکھا۔ ادا جعفری کئی ایک ممالک کا سفر کر چکی تھیں، ایسے ایسے قدرتی مناظر اور دل کو لبھانے والے شہر ہائے نگاراں دیکھے لیکن کہیں پر بھی ان کو وہ مسرتیں اور راحتیں نہیں ملیں جو پہلی مرتبہ ۱۹۶۹ء میں خانہ کعبہ کے گرد والہانہ طواف کرتے ہوئے ملیں۔ ادا جعفری نے اپنی خود نوشت میں "نگاہوں نے زمین کو آسماں دیکھا" کے عنوان سے اپنے سفر حجاز کا ذکر کیا ہے۔ ان کے اس سفر میں نظر ارض تمنا کے گرد طوف کرتی ہے اور حسرت و مسرت کے جذبات سے سرشار ہو کر وہ قلبی کیفیات کو ان صفحات پر منتقل کر دیتی ہیں۔ انھوں نے غارِ حرا تک پہنچنے کی جستجو کے واقعات کو بھی بیان کیا ہے۔

ادا جعفری نے اس خود نوشت میں پاکستان کے سیاسی اتار چڑھاؤ اور یہاں کا شعری و ادبی ماحول اور اس میں شامل شخصیتوں کا ذکر بڑی خوب صورتی کے ساتھ کیا ہے۔ جنرل ایوب خان، جنرل یحییٰ خان اور جنرل ضیاء الحق جیسے آمروں کا ذکر کرتے ہوئے وہ خاص طور پر بے باک نظر آتی ہیں۔ اس کے علاوہ اپنے ہم عصر شعرا اور ادبا کا ذکر بہت محبت

اور اپنائیت سے کیا گیا ہے۔ اس خود نوشت میں ادا جعفری نے اپنی ذات کو کبھی بھی توجہ کا مرکز نہیں بنایا بلکہ اپنی شخصیت کو کھل کر بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس خود نوشت میں تقریباً ڈیڑھ سو افراد کا مختصر ذکر بھی ملتا ہے۔ اس لیے اس خود نوشت کو شخصیت کا نگار خانہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ ان شخصیات کے تذکروں میں ادا جعفری نے کسی قسم کا تلخ، طنزیہ اور استہزائیہ رویہ اختیار نہیں کیا بلکہ جس کے بارے میں بھی لکھا نہایت خوب صورت اور بے دریغ الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے اس کی پوری شخصیت کو اُجاگر کر دیا۔ زندگی میں انسان کو اچھے بُرے ہر قسم کے حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اُسی مناسبت سے اچھے بُرے لوگوں سے بھی ملنا پڑتا ہے، ادا جعفری کو بھی بہت سے لوگوں نے دکھ پہنچایا لیکن انھوں نے اس خود نوشت میں اچھی یادوں اور لوگوں کا ذکر کیا۔ وہ لکھتی ہیں:

مقدور بھر جو راہ کا پتھر بنے رہے
وہ لوگ یاد آئے ہیں اکثر دعاؤں میں (۹)

ادا جعفری کی خود نوشت "جو رہی سو بے خبری رہی" کئی فنی و فکری پہلوؤں کا بھی خوب صورتی سے احاطہ کرتی ہے۔ یہ ایک ایسی عظیم فنکار کی کہانی ہے۔ جو بنیادی طور پر شاعرہ ہے اور ان کی نثر سے بھی ان کے شعری ذوق کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ انھوں نے مختلف مناظر، خاص مواقعوں اور خوب صورت جگہوں کو الفاظ کے خوب صورت پیرائے میں بند کر کے نظمیں اور غزلیں بھی کہیں جس کی ایک عمدہ مثال ان کی نظم "رخصت" ہے جو انھوں نے اپنی بیٹی صبیحہ کی شادی کے موقع پر تحریر کی۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں جس سے ادا کے شعری ذوق کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

اے مہماں آہستہ جا
کچھ دیر تجھ کو دیکھ لوں، کچھ دور تیرا ساتھ دوں
جانا تو ہے تجھ کو مگر آرامِ جاں، آہستہ جا
اے مہماں آہستہ جا
ہمراہ تیرے، رحمتِ ربِّ کریم و مہرباں
تجھ پر بہارِ زندگی ہو گُل فشاں، آہستہ جا
اے مہماں آہستہ جا (۱۰)

ڈاکٹر نوشاد عالم ان کی خود نوشت کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار یوں کرتے ہیں:

"ادا جعفری کے مشاہدے اور تخیل کا دائرہ بہت وسیع ہے، انھوں نے اس آپ بیتی میں مختلف دلکش و دیدہ زیب تصویریں بہت خوب صورتی کے ساتھ پیش کی ہیں۔ ان کے اندازِ بیان میں جو شائستگی، شرافت اور تہذیب ہے وہ قابل تعریف

ہے۔"(۱۱)

ادا جعفری کی یہ خود نوشت اُردو کے نثری سرمائے میں ایک بہترین اضافہ ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ادا جعفری، جو رہی سو بے خبری رہی، کراچی: مکتبہ دانیال، ۲۰۱۳ء، ص:۹

۲۔ ایضاً، ص:۲۴

۳۔ ایضاً، ص:۳۵

۴۔ ایضاً، ص:۱۳

۵۔ ایضاً، ص:۱۲۰

۶۔ ایضاً، ص:۱۳۳

۷۔ ادا جعفری، نظم بلاؤ، مشمولہ: غزالاں تم تو واقف ہو، لاہور: غالب پبلشرز، ۱۹۸۲ء، ص:۱۶۴

۸۔ ادا جعفری، جو رہی سو بے خبری رہی، ص:۲۱۱

۹۔ ایضاً، ص:۳۲۱

۱۰۔ ادا جعفری، نظم رخصت، مشمولہ: ساز سخن، نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۸۸ء، ص:۸۰

۱۱۔ محمد نوشاد عالم، ڈاکٹر، اردو خود نوشت سوانح حیات، آزادی کے بعد، اول ایڈیشن، دہلی: عرشیہ پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء، ص:۲۰۰